پروفیسر محمد اسلم صاحب۔ لاہور

لکھنؤ سے بنارس تک

۲۲ اگست ۱۹۸۱ء کی ایک سہانی صبح میں لکھنؤ سے بذریعہ بس رائے بریلی روانہ ہوا۔ لکھنؤ سے رائے بریلی کا فاصلہ ۶۶ کلومیٹر ہے۔ اور وہاں تک پہنچنے پہنچتے دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ بس اسٹینڈ پر مجھے ایک مسلمان رکشا ڈرائیور مل گیا۔ میں نے اس سے "تکیہ" کا اتہ پتہ پوچھا تو اس نے کہا "آپ مولانا علی میاں کے ہاں جائیے گا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا اور بے فکر ہو کر رکشا پر سوار ہو گیا۔

بس اسٹینڈ سے "تکیہ" کا فاصلہ تین کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ مقامی لوگ اسے بڑا تکیہ کہہ کر پکارتے ہیں میونسپل کمیٹی رائے بریلی نے مولانا علی میاں کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے قلعہ بازار سے تکیہ تک جانے والی سڑک کا نام سید مولانا ابو الحسن ندوی عرف علی میاں مارگ — رکھ دیا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رائے بریلی کے غیر مسلم بھی مولانا صاحب کا احترام کرتے ہیں۔

یہ سڑک سرسبز و شاداب کھیتوں سے گذرتی ہوئی تکیہ کی طرف جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف امرود کے پیڑ اور دھان کے کھیت نظر آتے ہیں۔ تکیہ سے ذرا پہلے میدان پور نام کی ایک مختصر سی آبادی آتی ہے وہاں ضیاء العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہے۔ جسے ندوۃ العلماء کے منتظمین چلا رہے ہیں۔

تکیہ میں گنتی کے چار پانچ مکان ہیں۔ اور ان میں سب سے نمایاں مکان مولانا علی میاں کا ہے۔ موصوف خود زیادہ وقت لکھنؤ میں گذارتے ہیں اور یہاں ان کی اہلیہ محترمہ رہتی ہیں۔ ان کے گھر سے متصل ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر حکیم عبد العلی مرحوم کا مکان ہے جہاں ان دنوں ان کے پوتے قیام پذیر ہیں۔

اسی بابرکت تکیہ میں ۱۷۸۶ء میں حضرت سید احمد بریلوی رحمہ اللہ پیدا ہوئے تھے اور یہیں ان کا بچپن گذرا تھا۔ جس مکان میں سید صاحب پیدا ہوتے تھے وہ اب موجود نہیں اور اب وہاں ایک نیا مکان بن گیا ہے۔ اتفاق سے مجھے ڈاکٹر عبد العلی کا ایک پوتا مل گیا اور اس نے مجھے تکیہ کی تمام اہم جگہیں دکھائیں۔

ڈاکٹر عبد العلی مرحوم کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر چھوٹی اینٹوں کی ایک مختصر سی چاردیواری ہے

جس کے اندر دس بارہ قبروں کے نشان نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قبر بھی نصف بالشت سے اونچی نہیں ہے اسی چاردیواری کے اندر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ اعظم حضرت آدم بنوریؒ کے مرید و مجاز شاہ علم اللہ رحمہ اللہ محوخواب ابدی ہیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے روایت ہے کہ جیسے انوار اس چاردیواری کے اندر نظر آتے ہیں ویسے انوار صرف "ٹُھاری" میں اس حجرہ کے اندر دکھائی دیتے ہیں جس میں سید الطائفہ میانجی نور محمد جھنجھانوی رحمہ اللہ رہا کرتے تھے۔ یہ بڑی بابرکت جگہ ہے۔ سید آدم بنوریؒ سے جو سلسلہ احسنیہ چلا ہے۔ یہ دائرہ اس نسبت کے انوار کا مظہر ہے۔

دائرہ شاہ علم اللہ رحمہ اللہ کے بالمقابل پرانے وقتوں کی ایک مسجد ہے جس میں بڑے بڑے بزرگوں نے اپنے رب کے حضور میں سجدے کئے ہیں۔ سید احمد بریلوی رحمہ اللہ بھی اسی مسجد میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ راقم الحروف نے حصول برکت کے لئے وہاں دوگانہ ادا کیا اور دائرہ میں مدفون حضرات کے لئے دعائے مغفرت کی۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک ندی بہتی ہے جسے "سیری" کہتے ہیں۔ اسی ندی کے پانی سے سید احمد بریلویؒ وضو کیا کرتے تھے۔ میں مسجد سے نکل کر مولانا علی میاں کے مکان کی طرف آیا۔ ان کے مکان کے سامنے مہمان خانہ ہے جہاں اس وقت چار پانچ حضرات تشریف فرما تھے۔ ایک نوجوان نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرا جواب سن کر اس نے کہا۔

"مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے بھی آپ کا تعلق ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا کہ اس نے مولانا ابوالعرفان ندوی سے میری تصنیف "سرمایۂ عمر" لے کر پڑھی ہے اور ماہنامہ بینات کراچی میں جشن دیوبند کے بارے میں میرے تاثرات بھی پڑھے ہیں۔ اس نوجوان نے چائے کی پیش کش کی لیکن میں اس وقت عجلت میں تھا اس لئے اس کی دعوت قبول نہ کر سکا۔

رائے بریلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب برابر ہے۔ شہر میں جا بجا پرانی مسجدیں موجود ہیں۔ قلعہ بازار کی مسجد خاص طور پر قابل دید ہے۔ شہر میں آثار قدیمہ بھی موجود ہیں اور بزرگوں کے مقبرے بھی۔ وہاں کی فضا پر سید صاحب کے انفاس طیبہ کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

رائے بریلی سے میں بذریعہ ٹرین امیٹھی روانہ ہوا۔ دونوں شہروں کے درمیان ۵۱ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ رائے بریلی کے بعد تیسرا ریلوے اسٹیشن جائس ہے جو ملک محمد جائسی صاحب پدماوت کی وجہ سے مشہور ہے۔ جائس کے بعد چوتھا اسٹیشن امیٹھی ہے۔ میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو وہاں دو تین رکشے کھڑے تھے۔ میں ایک رکشا ڈرائیور کو مسلمان سمجھ کر اس کے رکشا میں سوار ہو گیا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہندو ہے) میں نے اسے درگاہ پر چلنے کو کہا۔ اس نے جواب دیا کہ امیٹھی میں کوئی درگاہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یہاں حضرت نظام الدین امیٹھی والےؒ کی درگاہ ہے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے اسے شہر کی طرف چلنے کو کہا۔ جب ہم بازار پہنچے تو اس وقت ظہر کی

نماز ہو چکی تھی اور نمازی جامع مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے کہا کہ وہ ان سے دریافت کرے کہ حضرت نظام الدین کی درگاہ کہاں ہے؟ جب نمازیوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو میں نے کہا کہ اکبر کے عہد میں حضرت نظام الدین امیٹھی والے بہت بڑے بزرگ ہو گذرے ہیں۔ اور اورنگ زیب عالمگیر کے استاد ملا احمد جیون ان کی اولاد سے تھے۔ تعجب ہے کہ آپ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

اس پر ایک نمازی نے ذرا سوچ کر کہا۔ کہیں آپ بندگی نظام الدینؒ کا مزار تو تلاش نہیں کر رہا؟ میرے جواب دینے پر اس نے کہا کہ میں غلط جگہ پر آ گیا ہوں جس امیٹھی میں ان کی درگاہ ہے وہ ضلع لکھنؤ میں ہے اور یہ امیٹھی جہاں میں آ گیا ہوں ضلع سلطان پور میں ہے۔ ایک نمازی نے کہا کہ وہاں سے چار کلومیٹر کے فاصلہ پر رام نگر میں ملک محمد جائسی کی درگاہ ہے اور وہاں تک پختہ سڑک جاتی ہے۔ یہ انکشاف میرے لئے باعث مسرت تھا۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے بات کی تو اس نے کہا کہ وہ ایک روپیہ فی کلومیٹر لے گا۔ رام نگر کے راستے میں ہمیں بارش نے آ لیا۔ لیکن اس کے باوجود سفر جاری رہا اور ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔

رام نگر اسی نام کی ایک ریاست کی راجدھانی تھی۔ وہاں اب تک راؤ مادھو سنگھ کا محل اس ریاست کی گذشتہ عظمت یاد دلانے کو موجود ہے اس کے قریب ہی ایک مندر ہے جو کسی ستی ہونے والی رانی کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔

اب رام نگر ایک معمولی سا گاؤں نظر آتا ہے۔ آبادی کے آخری کنارے پر مسلمانوں کے چند گھر آباد ہیں اور وہاں ایک مسجد بھی موجود ہے جہاں آبادی ختم ہوتی ہے۔ وہیں ایک وسیع و عریض احاطے کے اندر ملک محمد جائسی کا مزار ہے۔ چار دیواری میں داخل ہونے کے لئے ایک عالیشان دروازے سے گذرنا ہوتا ہے اس دروازے کی پیشانی پر جلی حروف میں دیوناگری رسم الخط میں "سمادھ مہا کوی شری محمد جائسی رام نگر" لکھا ہوا ہے۔

احاطے کے وسط میں ایک بلند و بالا چبوترہ ہے اور اس کے وسط میں ایک اور چبوترہ بنایا گیا ہے۔ اس چبوترے پر محمد جائسی کی قبر ہے۔ جس وقت میں وہاں پہنچا اس وقت قبر پر سرخ رنگ کی چادر پڑی تھی اور اس پر یا اللہ اور یا محمدؐ کاڑھا ہوا تھا۔ قبر کے اوپر ایک چھتری بنی ہوئی ہے۔ جسے چھ ستون تھامے ہوئے ہیں۔

احاطے کی جنوبی سمت مسافروں کے قیام کے لئے ایک وسیع دالان تعمیر کیا گیا ہے۔ اور اس دالان کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا گیا ہے اس پر یہ غلط سلط عبارت منقوش ہے۔

"حضرت ملک محمد جائسی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر بارہ دری کا قیام عوام سے ۱۹۷۰ء میں پائے تکمیل کو پہنچا"

(عوام اور سے کے درمیان "چندہ سے" بڑھا دینے سے عبارت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ پائے کو پایہ پڑھیں تو املا درست ہو جاتی ہے)

درگاہ کے ایک خادم سے معلوم ہوا کہ وہاں ۴ رجب کو ملک صاحب کا عرس منایا جاتا ہے اور قرب و جوار کے دیہات سے ان کے معتقدین وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔

رام نگر سے امیٹھی واپس آیا۔ اس وقت نماز عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے جامع مسجد میں نماز ادا کی۔ یہ مسجد واقعی بڑی خوبصورت ہے۔ جامع مسجد سے رکشا میں سوار ہو کر اسٹیشن پہنچا تو بنارس جانے والی پسنجر ٹرین تیار کھڑی تھی۔

امیٹھی سے بنارس کا فاصلہ ۱۶۳ کلومیٹر ہے۔ میں عصر کے وقت امیٹھی سے روانہ ہو کر رات بارہ بجے کے قریب بنارس پہنچا۔ اسٹیشن کے قریب کسی ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہ تھا۔ ایک رکشا والے نے میری مدد کی اور وہ مجھے شہر کے ایک صاف ستھرے علاقے میں ایک نو تعمیر شدہ ہوٹل میں لے گیا۔ میں نے رات وہاں گذاری اور اگلی صبح ایک رکشا میں سوار ہو کر سمیرا گھاٹ پہنچا۔ بنارس میں گنگا کے ۴۸ گھاٹ ہیں اور سمیرا سب سے زیادہ مقدس مانا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ گنگا میں نہانے سے گناہ دھل جاتے ہیں۔

اس روز اتفاق سے جنم اشٹمی (کرشن چندر کا جنم دن) کا تہوار تھا اس لئے وہاں خوب رونق تھی۔ اہل ہنود بڑی عقیدت کے ساتھ گنگا میں اشنان کر رہے تھے۔ شیخ علی حزیں نے ایسا ہی منظر دیکھ کر کہا تھا ؎

پری رخان بنارس بصد کرشمہ و ناز — پی پرستش مہدیو چوں کنند آہنگ
بہ گنگ غسل کنند و بہ سنگ پا مالند — زہی شرافت سنگ و زہی لطافت گنگ

سمیرا گھاٹ سے میں اورنگ زیب عالمگیر کی مسجد دیکھنے گیا۔ یہ مسجد مندروں کے وسط میں ایک مندر کی بنیادوں پر ہی تعمیر کی گئی ہے اس مسمار شدہ مندر کے آثار اب بھی مسجد کی عقبی دیواروں میں دیکھے جا سکتے ہیں اور ہندو انہیں دیکھ کر اورنگ زیب کو کوستے ہیں۔ ادبی حلقوں میں یہ روایت زبان زد خلائق ہے کہ جب یہ مسجد تعمیر ہوئی تو سابقہ مندر کے پروہت نے اورنگ زیب کو یہ شعر لکھ کر بھیجا ؎

ببیں کرامت بت خانہ مرا اے شیخ — کہ چوں خراب شود خانہ خدا گردد

مسجد کو جانے والا معروف راستہ ان داتا کے مندر میں سے ہو کر گذرتا ہے اور جب میں مندر کی طرف جانے والی گلی میں داخل ہوا تو ایک ہندو دکاندار نے مجھے جوتے اتارنے کو کہا۔ میں نے وہاں جوتے اتار دیئے۔ لیکن اس نے اصرار کیا کہ میں مندر میں چڑھانے کے لئے پھول ضرور خریدوں۔ میرے انکار پر اس نے مجھے آگے جانے سے روک دیا۔

میں ۱۹۵۵ء کے اوائل میں بنارس آ چکا تھا۔ اس لئے مجھے معلوم تھا کہ مسجد کی طرف جانے کا ایک راستہ اور بھی ہے۔ میں نے پیچھے پلٹ کر وہ راستہ تلاش کرنا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں مسجد تک پہنچ گیا۔ مسجد کے

صحن میں ہر وقت پولیس گارد موجود رہتی ہے۔ یہ گارد میں نے ۱۹۵۵ء میں بھی دیکھی تھی۔ مسجد چونکہ چاروں طرف سے مندروں میں گھری ہوئی ہے اس لئے وہاں ہمیشہ فساد کا خطرہ رہتا ہے۔

یہ مسجد بڑی خوبصورت اور قابل دید ہے۔ مسجد کے دالان میں داخل ہونے کے لئے گیارہ دروازے بنائے گئے ہیں۔ ان دروازوں پر لوہے کی گرل لگا دی ہے اور فرش پر سفید چاندنیاں بچھا دی گئی ہیں۔ وہاں پنج وقتہ نماز کے علاوہ جمعہ بھی ہوتا ہے۔ مسجد کے ساتھ دو خوبصورت مینار بھی تعمیر کئے گئے ہیں جو دور دور سے نظر آتے ہیں۔

بنارس ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے۔ اورنگ پورہ۔ للّہ پورہ۔ اور لہنگ پورہ مسلمانوں کے مشہور محلّے ہیں۔ میں نے ان محلوں میں " بڑا گوشت " کھلے بندوں فروخت ہوتے دیکھا ہے۔ ریوڑی تالاب پر اہل حدیث کا ایک بڑا مدرسہ ہے جو جامعہ محمدیہ کے نام سے مشہور ہے یہ مدرسہ بھارت میں اہل حدیث کی سب سے بڑی درسگاہ ہے

میرے لئے بنارس میں ایک اور بھی کشش کی جگہ تھی جسے میں پہلے سفر میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ بنارس روانہ ہونے سے پہلے میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے استاد ڈاکٹر امیر حسن عابدی سے ملا تھا۔ اور ان سے شیخ علی حزیں کے مزار کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بنارس میں فاطمان نام کا ایک امام باڑہ ہے اور وہیں علی حزیں مدفون ہے۔

میں نے یکے بعد دیگرے کئی رکشا والوں سے فاطمان چلنے کو کہا۔ لیکن وہ اس جگہ سے ناواقف تھے کوئی مسلمان رکشا والا مل نہیں رہا تھا جو میری رہنمائی کرتا۔ سمیر گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے نئی سڑک پر ایک جگہ فاران ہوٹل کا نام پڑھا تھا۔ اس لئے میں اس ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے اس کے مالک سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو اس نے کہا کہ اس نام کا امام باڑہ للّہ پورہ میں موجود ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی رکشا والے کو اس کا اتہ پتہ بتا دے جو مجھے وہاں پہنچا دے۔ اس بھلے مانس نے ایک رکشا والے کو فاطمان کا محل وقوع سمجھا دیا اور وہ مجھے وہاں لے گیا۔

یہ امام باڑہ ایک قبرستان میں واقع ہے اور شیعہ سنی فساد کو روکنے کے لئے وہاں پولیس متعین رہتی ہے میں نے ایک سپاہی سے حزیں کی قبر کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے کہا کہ وہ اس سے واقف نہیں ہے۔ البتہ وہاں کے خدام میری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اتنے میں ایک خادم ادھر سے گذرا تو میں نے علی حزیں کی قبر کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے سوچ کر کہا " آپ شیخ حبین کی قبر کا پتہ پوچھتے ہیں؟ " میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مجھے شیخ کی قبر پر لے گیا۔

حزیں کی قبر سنگ مرمر کے ایک چبوترے پر ہے۔ اور تعویذ پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

العبد الراجی

رحمة ربه محمد المدعو بعلی بن ابی طالب اللاهیجی

حزیں از پای رہ پیما بسی سرگشتگی دیدم
سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید این جا
زبان دان محبت بودہ ام دیگر نمی دانم
ہمیں دانم کہ گوش از دوست پیغامی رسید این جا
روشن شد از وصال تو منشک بار
صبح قیامت چراغ مزار ما

قبر کے سرہانے ایک سل نصب ہے جس پر یہ عبارت منقوش ہے:

"شیخ علی حزیں - وفات ۱۱ جمادی الاول ۱۱۸۰ھ

علی حزیں کی قبر پر پتھروں کو کھود کر پرندوں کے پانی پینے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ اور وہاں اگربتیاں جلنے کے آثار بھی موجود تھے۔ قبر کے سرہانے ایک چراغ دان بھی بنا ہوا ہے۔

حزیں کی قبر سے چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی موجود ہے جس میں نماز کے وقت دو صفیں ہو سکتی ہیں۔ میں ابھی مزار پر ہی تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ میں نے اسی مسجد میں پناہ لی اور بارش تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔ مسجد کے محراب کی پیشانی پر یہ قطعہ تاریخ مرقوم ہے:۔

آن محمد جعفر عیسیٰ نفس — بانی مسجد شد از لطف کریم
مصرع تاریخ باشد حسب حال — حکمت نیک است این فعل کریم

اسی قبرستان میں ایک چار دیواری کے اندر حضرت فاطمة الزہراؓ کی قبر بنا رکھی ہے اور ایک گوشے میں ثانی الزہرا بی بی زینبؓ کا مزار بنایا ہوا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یہ امام باڑہ "فاطمان" کہلاتا ہے۔ ایک گنبد کے نیچے حضرت علیؓ محو خواب ابدی دکھائے گئے ہیں۔

حزیں کی قبر سے جانب شمال چند میٹر کے فاصلہ پر ایک چھتری کے نیچے حضرت عباس علمدار کی قبر بنائی ہوئی ہے اسی طرح ایک تہ خانے میں حضرت حسینؓ کا مزار بھی بنایا ہوا ہے۔ بنارس کے اثنا عشریوں کو عراق و عرب جانے کی ضرورت نہیں وہ گھر بیٹھے بٹھائے ان بزرگوں کے مزارات کی زیارت کر لیتے ہیں۔

آمدم بر سر مطلب! علی حزیں فارسی زبان کا بہت بڑا شاعر تھا اور وہ اپنے مقابلے میں ہندوستان کے

کو "پوپ گویان ہند" کہا کرتا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نواب صدر یار جنگ نے اس کی قبر کو "فارسی غزل کا مدفن" قرار دیا ہے۔ ان کی یہ رائے ہے کہ حزیں کے بعد پھر اس پائے کا فارسی غزل گو پاک و ہند میں پیدا نہیں ہوا۔

حزیں کو بنارس کے ساتھ والہانہ عشق تھا وہ ۱۱۶۳ھ میں یہاں آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بنارس کے بارے میں اس کا یہ شعر زبان زد خلائق ہے ؎

از بنارس نروم معبد عام است اینجا		ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

بعض تذکروں میں بچہ کی جگہ پسر بھی لکھنے میں آیا ہے لیکن اہل ذوق بچہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

حزیں سے پہلے ملا طغری مشہدی (م ۱۰۷۰ھ) نے بھی بنارس کے ہندوانہ ماحول کو موضوع سخن بنایا تھا اس کا ایک شعر ہے ؎

طغری بعشوہ خانۂ دل چو راہ نیست		ہر کرشمہ زاد بنارس غنیمت است

محمد یوسف نکہت برہانپوری المعروف بہ مجنوں خان نے بھی بنارس میں کچھ وقت گزارا تھا وہ بھی بنارس کے ماحول سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اہل بنارس کے بارے میں اس نے کیا خوب کہا ہے ؎

بنارس زادگان شوخ اندیشہ		ہمہ گستاخ و چشمک باز پیشہ

بنارس عہد عتیق ہی سے ہندوؤں کے علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر میں بارہ سو کے قریب مندر اور پانچ سو شوالے ہیں۔ مشہور مصلح بھگت کبیر بھی بنارس کا رہنے والا تھا اور یہیں سے اس نے اپنے مشن کا آغاز کیا تھا۔ عہد اسلامی میں بڑے نامی گرامی مسلمان علماء و ادباء یہاں رہتے تھے۔ عہد جہانگیری میں ملا سعد اللہ پانی پتی یہاں مقیم تھا وہ بڑا اچھا شاعر تھا۔ دارا شکوہ کا منشی بنواری داس ولی جو فارسی کا انشا پرداز تھا، بنارس ہی کا تھا۔ دارا شکوہ نے یہاں کافی وقت گزارا۔ اور یہیں اس نے پنڈتوں کی مدد سے ہندوؤں کی مقدس کتاب اپنشد کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا تھا۔ اپنشد کا فارسی ترجمہ سر اکبر کے نام سے مشہور ہے۔ بنارس میں قیام کے دوران دارا شکوہ نے مجمع البحرین لکھ کر ہندو مت اور اسلام کے درمیان ایک درمیانی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ دارا شکوہ کا ہندو مت کی طرف رجحان اور ملحدانہ عقائد کے پیش نظر علامہ اقبال نے خوب کہا ہے ؎

تخم الحادے کہ اکبر پرورید		باز اندر فطرت دارا دمید

بنارس سے چھ کلو میٹر کے فاصلہ پر سارناتھ ہے جو بدھوں کا متبرک مقام ہے

علی حزیں کی قبر دیکھ کر میں سیدھا ہوٹل پہنچا۔ اور اپنا سامان اٹھا کر ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ دو بجے کے قریب مجھے پٹنہ جانے والی ٹرین مل گئی اور میں شام کے ساڑھے سات بجے وہاں پہنچ گیا۔ (باقی)